

شہرِ ممبئی

علی احمد جلیلی

ناشر

یونیورسل بک اسٹال، چوک، حیدرآباد ۲

اے۔ پی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

پہلی بار : ایک ہزار

سنہ اشاعت : ۱۹۷۷ء

یہ تعاون اُردو اکیڈمی - آندھرا پردیش

خوش نویس : محمد ضیاء الدین نظامی

قیمت : دس روپے

ملنے کے پتے

اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش سیف آباد حیدرآباد ۲

جلیل منزل - محلہ سلطان پورہ - حیدرآباد ۲۴

دفتر تعمیر ہفتہ وار، محبوب نگر (اے پی)

مطبوعہ:

دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

سرورق، انتخاب پریس

غزلیں

ترتیب

- ۱۱ روکے سے کہاں حادثہٴ وقت رکا ہے
 ۱۳ جبر، کبھی حد سے بڑھیں تنہائیاں
 ۱۵ خشک ہونٹوں پہ تبسم کی کرن ہو جیسے
 ۱۶ زخم کا رشتہ تبسم سے ملا لیتے ہیں لوگ
 ۱۹ ہے زندگی کا گرد سے چہرہ اٹا ہوا
 ۲۱ رات کے بڑھتے اندھیروں کو سزا دی جائے
 ۲۳ نہ جانے کوئی منزل پہ لیکے آیا ہے
 ۲۴ آپ چادرتان کر سوتے رہے
 ۲۶ خوبصورت تھی یہ دنیا کبھی آنچل کی طرح
 ۲۸ پھونکوں سے بجھا ہوں نہ مٹانے سے مٹا ہوں
 ۲۹ بڑھیں قافلے کیانے فکروں کے
 ۳۱ محسوس کروں بدن کو تیرے
 ۳۳ ہجوم شوق میں اپنا کہیں پتا نہ ملا
 ۳۵ دل کو چھو کر کون یہ گزرا
 ۳۷ ہنگامہٴ نشاط، نہ طوفانِ حادثات
 ۳۸ پھول برے کبھی ہر سمت سے پتھر گئے
 ۴۰ فریبِ نکہت و گلزار سے بچاؤ مجھے
 ۴۲ راتِ یادوں، جو تری زلف کا پھیلا ہوگا
 ۴۴ ملی حیات تو ڈالے ہوئے نقاب ملی
 ۴۵ کون اس سمت سے گزرا ہے شراروں کی طرح
 ۴۷ کون یہ آیا برا کندہ نقاب

- چاند سورج کی نگاہوں سے چھپاؤ مجھ کو ۴۹
 وہی ہے کل کے اندھیر دل کا سامنا اب بھی ۵۱
 پیار کرتا ہوں میں سزا دیدو ۵۳
 ہے ترے شہر کی یہ رسم عجیب ۵۵
 اشک کی بوند کو ہلکوں پہ سجائے رکھئے ۵۷
 لے چلو ہاتھ میں لوگو پتھر ۵۹
 ہم شہر میں تھے یا کسی صحرا میں پڑے تھے ۶۱
 دھوپ سے بھاگے تو ہم کو کیا ملا ۶۳
 موسم گل ابھی اے جاں جنن باقی ہے ۶۵
 اڑی اڑی ہوئی رنگت بچھے بچھے تیور ۶۷
 اس شہر میں دیکھوں جسے اپنا سا لگے ہے ۶۹
 اب یہی ہر آدمی کی بات ہے ۷۱
 وقت کی دھوپ سے بچنے کا مارا ابھی نہیں ۷۲
 کوئی شیشہ ہی ہاتھ سے چھوٹے ۷۳
 مزاج طنز کا ہر اک سخن میں کتنا تھا ۷۴
 بات اب تک جو بھی پردہ داروں کے بیچ ۷۵
 تمام عمر تھیل میں سننا تھا ہے ۷۶
 یہ کس مقام پہ پہنچی ہے لے کے بے وطنی ۷۷

نظمیں

- شہر سخن ۸۱ نیا دور ۸۴ ٹوٹے تارے ۸۶
 فاصلہ ۸۷ سنگ میل ۹۰ مشاہدہ ۹۲
 یہ رات ۹۴ اندھیرا ۹۷ ٹھنڈی کرن ۹۸
 پیاس ۱۰۰ لہو ۱۰۰

غزلیں

- اُن کے ہونٹوں سے چُن کر گلاب دسمن ۱۰۳
 کوئی جھونکا جو دبے پاؤں چلارات گئے ۱۰۵
 بال بکھر کے چہرے پہ ڈالے گئے ۱۰۷
 کون جانے کدھر آتی ہے کدھر جاتی ہے ۱۰۹
 وقت نے جب دھوپ پھیلائی بہت ۱۱۱
 گلشن گلشن دام بہت ہیں ۱۱۳
 وقت کو جب بھی اسیر دل کا خیال آیا ہے ۱۱۴
 آنکھوں سے دل کا درد جھلکتا دکھائی دے ۱۱۵
 درد کے ڈھیر ملے زخم کے انبار ملے ۱۱۶
 فضا بہار کی چُپ، ساند کی نوا خاموش ۱۱۷
 ایک مدت ہوئی مسکراتے ہوئے آئیگی آتے آتے ہنسی دوستو ۱۱۹
 خوشی نے مجھ کو ٹھکرایا ہے درد و غم نے پالا ہے ۱۲۰
 ایسی بھی زندگی میں دعا مانگتے ہیں لگد ۱۲۲
 سنتے ہیں غم و درد میں تاثیر بڑی ہے ۱۲۳
 اب جھلکتے ہوئے ساغر نہیں دیکھے جاتے ۱۲۴
 نہر غم پی کے ہنسی ہونٹوں پہ بکھرا لائے ۱۲۵
 میرے احباب کو اب فکر یہی رہتی ہے ۱۲۶
 آپ کے ہونٹوں کی سرخی ہو ہو ۱۲۷
 کتنے افسانے بنے پیار کی رسوائی تک ۱۲۹
 آپ کے ساتھ اور یہ لمحات ۱۳۱

- ۱۳۳ وہ آتے ہیں پلکوں پہ آنسو سجائے
 ۱۳۵ کانٹوں سے تھے بھرے ہوئے گلشن جگہ جگہ
 ۱۳۶ انگڑائی کے جال تن رہے ہیں
 ۱۳۷ روز اک غم سے ملاقات ہوئی جاتی ہے
 ۱۳۸ زندگی آج بعنوان دگر یاد آئی
 ۱۳۹ خشک ہونٹوں پہ کیا ہنسی آئی
 ۱۴۰ اور چہرہ کوئی چہرے پہ لگایا جائے
 ۱۴۱ مے کے، مینا کے جام کے رستے
 ۱۴۳ خوشی کی دھوپ تبسم کی چاندنی نہ ملی
 ۱۴۵ تم اہل ظرف ہو پہلے یہ فیصلہ تو کرو
 ۱۴۷ پردہ وقت بدلتا رہا نظر تفتے
 ۱۴۹ ہم نے دنیا کو روشنی دی ہے
 ۱۵۰ دن ہے وہی سورج ہے وہی صبح وہی ہے

گفتنی

بیاوردید گرایخبا بود زباں دلنے
غریب شہر سخہائے گفتنی دارد

میری غزلیات کا پہلا مجموعہ "نقش قدم" سات سال پہلے طبع ہوا تھا۔ اس پہلے مجموعہ سے دوسرے مجموعہ "شہر تنہا" تک میں نے کوئی لمبا سفر طے نہیں کیا ہے۔ پھر بھی اس عرصہ میں میری غزل کے لمحہ اور فکر و اسلوب میں کچھ نئے موڑ آگئے ہیں۔ نصف غزل میں بالخصوص آج جس تیزی سے رد و بدل ہو رہا ہے اور داخلی و خارجی طور پر نت نئے تجربے جو آپس کئے جا رہے ہیں اس نے غزل کی پوزیشن بہت نازک کر دی ہے۔ ایک طرف نئے ڈکشن کا رجحان ہے جس نے غزل کو ایسے الفاظ سے بوجھل کرنا شروع کر دیا ہے جو اس کے مزاج سے قطعی میل نہیں کھاتے۔ دوسری طرف "گھردری غزل" اور "آزاد غزل" کے تجربے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ انہیں اب تک قبول عالم نہیں ملا ہے۔ میں متوازی قلم رکھنے کا عادی ہوں۔ آرٹ کی سطح پر جلد بازی کا قائل نہیں۔ نتیجہ یہ کہ پہلا مجموعہ "نقش قدم" جب شائع ہوا اور ایک جدید نقاد کے ہاتھ میں نہرہ دیکھنے پہنچا تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے ایک طرف رکھ دیا کہ یہ تو روایتی شاعری ہے مشکل تو یہ ہے کہ جدید ذہن غزل میں غزل کے علاوہ اور سب کچھ ڈھونڈنے کا عادی ہے اور میں غزل کو صحافت یا اشتہار کی صف میں لا کر کھڑا کرنا نہیں چاہتا۔

میں مانتا ہوں کہ آج کے شاعر کو پہلے شاعروں سے ذہنی طور پر مختلف ہونا چاہیے۔ گونگہ بھوک کی پیش سے جب جسم کھلتا ہو تو شبیر و گل کی لطافت کی باتیں نہیں کہی جاسکتیں۔ مجھے غزل کی روایتی فرسودگی کا پورا احساس ہے۔ قدیم دبستان سے قریبی وابستگی کے باوجود روایت پرستی کو میں نے کبھی محسوس نہیں سمجھا ہے۔ قدامت کی جگہ جدت یقیناً قابلِ تعریف ہے لیکن مسیحہ سامنے غزل کا ماضی بھی ہے۔ اس کی روایت بھی اور اسکے امکانات بھی۔ رعایت کو برتنا اور روایت سے کام لینا دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ نیا پن پرانے پن کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ من و سلویٰ کی طرح آسمان سے نازل نہیں ہو جاتا۔ اس پس منظر میں میں جدید شاعر نہیں ہوں، جدید عہد کا شاعر ہوں۔ چنانچہ میں نے عصری حیثیت کو بھی اپنے شعروں میں غزل کی آرائش خم کا کل کے ساتھ نظم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں جو نیا پن داخل کیا ہے اسے نئے اسلوب کی دین سمجھتا ہوں۔ شاعری کا معاملہ یہ ہے کہ وہ تاج محل جی ہوتی ہے اور ٹوٹی ہوئی قبر بھی۔ سوال صرف برتنے کے سلیقہ کا ہے۔

جہاں تک غزل کی رمزی علامتوں کا تعلق ہے میں یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ الفاظ اور امیج کی بھی عمر ہوتی ہے۔ میں مثبت انداز میں سوچتا اور سمجھتا ہوں کہ ان کے فنکارانہ استعمال سے نئی دشائیں کھولی جاسکتی

ہیں۔ بشرطیکہ الفاظ کو جذبہ کی شکل میں محسوس کیا جائے۔ نئی زبان بنانے یا نئے الفاظ کو غزل میں داخل کرنے کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان کا انتخاب ایسا ہونا ضروری ہے کہ وہ غزل کے مزاج اور آہنگ کو برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

ایک بحث شاعری میں شخصیت و مقصدیت کی ہے۔ میر انقطہ نظر یہ ہے کہ غزل کی شاعری میں مقصدیت کا عنصر نہ رہنا چاہیے۔ یہ بات دوسری ہے کہ صنف غزل کو مقصدی شاعری کیلئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور اس کی آواز میں زوال خوردہ معاشرہ کی چھین بھی شامل کی جاسکتی ہیں کیونکہ اپنی ذات یا شخصیت کو باقی دنیا سے الگ رکھ کر سوچنا ممکن نہیں۔ تاہم کسی مقصد یا نظریہ کی پابندی خود اپنے اوپر عائد کر لینا غزل کو اس کی شعریت محروم کر نہیے۔ ”شہرِ متنا“ کی ترتیب میں میں نے پہلے ان غزلوں کو جگہ دی ہے جو بعد میں کہی گئی ہیں اور جن کا سلسلہ حال سے ملتا ہے۔ پہلے کہی ہوئی غزلیں آخر میں ہیں۔ ان دونوں کے رنگ و آہنگ میں جو فرق ہے اس میں فصل قائم رکھنے کیلئے درمیان میں نظمیں دیدی گئی ہیں۔ نظمیں ان نظموں میں سے چند ہیں جنہیں علامہ مجموعہ کی صورت دیدار ہی ہے مجھے دیانت داری کے ساتھ یہ اعتراف ہے کہ میں نے اپنی طویل ادبی زندگی میں جو کچھ لکھا اپنی شعری صلاحیتوں کے اعلان کیلئے نہیں بلکہ اپنے جذبہ کی تسکین کیلئے لکھا۔ تحسین دستاؤش کی متنا مجھے کبھی نہیں ہوئی۔ میرے لئے یہی کیا کہ ہے کہ میں شاعر ہوں۔

میں جناب علی سردار جعفری اور جناب مخدوم سعیدی کا بیحد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میرے کلام پر اپنی رائے کا اظہار فرمایا۔

علی احمد جلیل

جلیل منٹرل - سلطان پورہ

حیدر آباد ۲۴

آندھرا پردیش

غزلیں



یہ کارِ شیشہ گری ہے نہیں ہے سنگِ زنی

کیا کسی شہرِ تنہا کی حدیں آپہنچیں
 خوبصورت ہے ہر اک موڑ نگاروں کی طرح



روکے سے کہاں حادثہ وقت رکا ہے
شعلوں سے بچا شہر تو شبنم سے جلا ہے

کمرہ کی مانوس سی خوشبو سے بسا ہے
جیسے کوئی اٹھ کر ابھی بستر سے گیا ہے

یہ بات الگ ہے کہ میں جیتا ہوں ابھی تک
ہونے کو تو سو بار مراقبہ قتل ہوا ہے

تھاماتھا جسے شیشہ و کانور سمجھ کر
ہاتھوں سے وہی چھوٹ کے پتھر پڑا ہے

روداد چراغاں تو بہت خوب ہے لیکن
یہ بھی تو کہو کس کا لہو اس میں جلا ہے

پھولوں نے چرا لی ہیں مجھے دیکھ کے آنکھیں
کاشٹوں نے بہت دور سے پہچان لیا ہے

ہر شخص ہے ہاتھوں میں صلیب اپنی اٹھائے
جبنا ہی مرے دور میں جیتے کی سزا ہے

اس رنگ تغزل پہ علی چھاپ ہے میری
یہ ذوق سخن مجھ کو وراثت میں ملا ہے



جب کبھی حد سے بڑھیں تنہائیاں
آگیں نزدیک کچھ پر چھائیاں

پھول چننے کا سلیقہ چاہئے
لوگ کر لیتے ہیں زخمی انگلیاں

یار ہا ہم پاس ان کے بیٹھ کر
تا پنتے ہیں قربنوں کی دویاں

شبنم و گل کا تصدق دوستو
اس طرف بھی ایک دو چنگاریاں

رنگ تھا وہ یا ہمارا تھا لہو
آپ نے کھیلی ہیں جس سے ہولیاں

بیچ دی ہم نے قلم کی آبرو
باٹے رے فیکار کی مجبوریاں

کیوں اندھیرے اے علی یدنام ہیں
چاندنی میں بھی ہوئی ہیں چوریاں





خشک ہونٹوں پہ تبسم کی کرن ہو جیسے
ریگزاروں میں گلابوں کا چپلن ہو جیسے

اس تکلف سے انہیں ہاتھ لگاتا ہے خیال
کوئی ترشا ہوا شیشے کا بدن ہو جیسے

مسمیٰ — مسمائی ہوئی اپنی ہی پہنائی میں
زندگی بھی مرے بستر کی شکن ہو جیسے

جھپٹے کپڑوں کی مٹھوں میں یہ سراپا تیرا
بادلوں میں کوئی ملفوف کرن ہو جیسے

آج بھی زخم کی صورت مرے دل کے قریب
میٹھی میٹھی تری یادوں کی چھین ہو جیسے

رات چہرے پہ صلیبوں کی لگائے ہوئے دھول
صبح اوڑھے ہوئے مہلا سا کفن ہو جیسے

اُف یہ انداز تری ٹوٹتی انگڑائی کا
اس میں شامل مرے خوابوں کی تھکن ہو جیسے

ہو گئے جس کے روایات علی خواب و خیال
اب بھی آنکھوں میں وہ تصویر دکن ہو جیسے



زخم کا رشتہ تبسم سے ملا لیتے ہیں لوگ
بار غم اب اس سلیقہ سے اٹھا لیتے ہیں لوگ

ظلمت شب حد سے بڑھتی ہے تو گھبرا کر کبھی
شمع کے دھوکے میں دل اپنا جلا لیتے ہیں لوگ

آج تیرے شہر میں قاتل کی ہے وہ آبرو
دامنوں پر خون کے دھبے لگا لیتے ہیں لوگ

تیری زلفوں کی عتایت تیرے آنچل کا کرم
زندگی کی دھوپ کو سایہ بنا لیتے ہیں لوگ

آگ سے جو کھیلے ہیں بات ان کی چھوڑے
شبم و گل سے بھی ہاتھ اپنے جلا لیتے ہیں لوگ

لطف گلچینی سے کم پتھر او کی لذت نہیں
پھول جب ملتے نہیں پتھر اٹھا لیتے ہیں لوگ

کل ترستا تھا زمانہ تیرے دامن کیلئے
آج تیرے ہاتھ سے دامن چھڑا لیتے ہیں لوگ

کون کس کا درد بانٹے ہے علی اس دور میں
اپنی لاش اپنے ہی کا دھوں پر اٹھا لیتے ہیں لوگ



ہے زندگی کا گرد سے چہرہ اٹا ہوا
جیسے کوئی غریب — مسافر تھکا ہوا

رحمت نہ ہو تو آپ کے دامن میں ڈالوں
آنکھوں میں رہ گیا ہے اک آنسو بچا ہوا

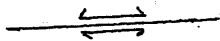
کچھ بات ہے ضرور کہ لٹنے کے باوجود
اب تک ہوں ہر نگاہ کا مرکز بیتا ہوا

رکتا ہوں ہر قدم پہ قدم احتیاط سے
رستے میں کون ہے یہ بکھر کر پڑا ہوا

ہونٹوں پہ برگ گل سے پخوڑی ہوئی ہنسی
عارض میں آفتاب ہو جیسے پسما ہوا

زلفوں کے خم میں رات کا دم توڑتا خمار
آنچل کی سلوٹوں میں سویرا لٹکا ہوا

کل تک علیٰ میں سر سے قدم تک تھاروشنی
ہوں آج اپنے جسم کا سایا بنا ہوا



ہنگامہ حیات سے جب واسطا پڑا
ہر حادثے سے اپنا پتہ پوچھنا پڑا



رات کے بڑھتے اندھیروں کو سزا دی جائے
 تو ذرا دل کے چراغوں کی بڑھا دی جائے

کیا اسی واسطے سینچا تھا لہو سے اپنے
 جب ستور جائے چین آگ لگا دی جائے

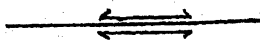
دور تک دل میں دکھائی نہیں دیتا کوئی
 ایسے ویرانے میں اب کس کو صدا دی جائے

اپنے لٹنے کا یہ احساس تو باقی رہ رہے
 کیوں نہ یہ ہوش کی دیوار گرا دی جائے

تبصرہ بعد میں بھی قتل پہ ہو سکتا ہے
پہلے یہ لاش تو رستے سے ہٹا دی جائے

عقل کا حکم کہ ساحل سے لگا دو کشتی
دل کا اصرار کہ طوفان سے لڑا دی جائے

مصلحت اب تو اسی میں نظر آتی ہے علی
کہ ہنسی آئے تو آنکھوں میں بہا دی جائے



وقت کے ہاتھوں نے ہم کو کیا دیا
چھین کر بینائی آئینا دیا



نہ جانے کونسی منزل پہ لیکے آیا ہے
وہ نقشِ پا جو تمناؤں نے بنایا ہے

ابھی ابھی جو گیا ہے قریب سے اٹھ کر
وہ آدمی نہیں اک — آدمی کا سایا ہے

غریبِ شہر کے ہاتھ اور کچھ نوکیلا آٹا
تمہارے شہر سے پتھر اٹھا کے لایا ہے

تمہارے جسم کی ویرانیوں سے کیا مجھ کو
مرے خیال کا صحر ا سجا سجا یا ہے

شفق جہاں سے سلگتے بدن کی پھوٹی ہے
دھنک میں رنگ — کا طوفان وہیں سے آیا ہے



آپ چادر تان کر سوتے رہے
شہر میں بدنام ہم ہوتے رہے

زندگی اک رات تھی اور رات بھر
لاش اراٹوں کی ہم ڈھوتے رہے

سکتے گیسو آکے میسے ہاتھ میں
پیچ و خم کا بانگین کھوتے رہے

ساغروں میں تشنگی پیتی رہی
اور میخانے لہوروتے رہے

تجھ کو لفظوں میں سمونے کے لئے
پہلے ہم اُن کا بدن دھوتے رہے

آپ کو ہمراہ میسر دیکھ کر
حادثوں میں مشورے ہوتے رہے

جو کسی کے قتل میں شامل نہ تھے
وہ بھی دھسے خون کے دھوتے رہے

اشک ٹپکے ان کی آنکھوں سے علی
میرے افسانے رقم ہوتے رہے



تو بصورت تھی یہ دنیا کبھی آنچل کی طرح
آج بے فیض ہے برسے ہوئے بادل کی طرح

اپنی ہی ذات میں بکھرا ہوا انسان ہے آج
فرشِ مینخانہ پہ ٹوٹی ہوئی بوتل کی طرح

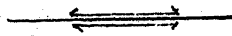
اپنی بھیسگی ہوئی زلفوں کو پھوڑا کس نے
ورد کی رات ہی جاتی ہے کاجل کی طرح

کتنے ڈوبے ہوئے سورج نکل آئے لیکن
اب بھی آنکھوں میں اندھیرا ہے وہی گل کی طرح

آپ سرکار نہ قاتل ہیں نہ خونی لیکن
شہر کیوں اپنا سجا رکھا ہے مقتل کی طرح

رقص ہم کرتے رہے پاؤں کی زنجیر کے ساتھ
اور زنجیر چپکنی رہی پائل کی طرح

اپنا احسان ہے دنیا کے اندھیروں پہ علی
ہم سلگتے رہے ہر دور میں مشعل کی طرح



تو سمندر ہے نہ بادل ہے نہ آس
پھر تجھے کیوں دیکھ کر بڑھتی ہے پیاس



پھونکوں سے بچھا ہوں نہ مٹاتے سے مٹا ہوں
میں وقت ہوں تاریخ کے چہرے پہ لکھا ہوں

گھبرا کے چھڑایا تھا جہاں آپ نے امن
اب تک اسی دیوار کے سایے میں کھڑا ہوں

چمن بھی لئے ہر اک — نے مقاماتِ نشیمن
میں ہوں کہ ابھی شاخِ چمن ڈھونڈ رہا ہوں
دنیا ہے کہ پھولوں کی خوشامد میں لگی ہے
اک میں ہوں کہ کانٹوں میں لہو بانٹ رہا ہوں
آپؐ آئی کسی پر نہ علیٰ مسیری طرف سے
سدا ہوں سلیقے سے قرینے سے بچھا ہوں

بڑھیں قافلے کیا تئے فکر و فن کے
کھڑی ہیں روایات دیوار بن کے

خیالوں کی بد صورتی کو چھپانے
لگا لائے چہرے گلاب و سمن کے

جو رکھتے تھے کل اپنی مٹھی میں سوچ
وہ محتاج ہیں آج اک اک کرن کے

اندھیروں سے کر لی ہے سازش جنھوں نے
بجھا دوسب ایسے چراغ انجمن کے

چلے آؤ دنیا کی نظر میں بچا کر
دبے پاؤں ایسے کہ پاٹل نہ چھنکے

سنبھل کر ذرا ہاتھ ان کو لگاتا
کہیں ٹوٹ جائیں نہ شیشے بدن کے

جہاں بھی کسی جسم کا پھول مہر کا
چلی آئی دنیا خسریدارین کے

علیٰ مہکدہ ہے یہ فکر اور فن کا
یہاں ہوش اڑتے ہیں اہل سخن کے



محسوس کروں بدن کو تیرے
اتنا بھی نہ ہو قریب — میرے

جانبی دہلیز میں سمٹ کے غریب
کچھ سایے جہاں ملے گھنیرے

ظلمت کو صلیب پر چڑھانے
زیستے سے اترتے ہیں سویرے

تنہائی کا خون کر کے شب بھم
جاتا ہے وہ کوئی منہ اندھیرے



حالات کے مرتبے ابھی تک
 چہرے پہ لکھے ہوئے ہیں میرے
 ہو جائے نہ رات ریزہ ریزہ
 یا نہ ہوں کے سمٹ رہے ہیں گھیرے
 رخسار سے پھوٹی شفق سی
 آئینہ میں مکے ہوئے سویرے
 رہتا ہوں میں اس کے پاس گویا
 تکیہ پہ لکھے ہیں شعر میرے
 تاریخ ہیں دورِ حاضرہ کی
 شبِ نیم سے جلے ہوئے بسیرے



ہجوم شوق میں اپنا کہیں پتا نہ ملا
وہ بھیڑ تھی کہ نکلنے کا راستا نہ ملا

رکے تو بڑھ گئے کچھ اور فاصلے جیسے
چلے تو چار قدم کا بھی فاصلہ نہ ملا

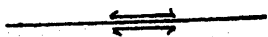
ہر ایک پھول پہ تھی چھاپ باغبانوں کی
ہمارے خوں کا چھینٹ کہیں نہ ملا

کلی کی طرح چٹک کر نموش ہو جاتے
ہمیں تو اتنا غم بھی اے صبا نہ ملا

سبک خرام تھے ایسے بہار کے جھونکے
گزر گئے تو کہیں ان کا نقش پا نہ ملا

تری گلی کی سیاست عجب نظر آتی
کہیں سے کوئی دریچہ کھلا ہوا نہ ملا

نقاب اتار کے رکھ دے علی جو چہروں سے
ہمیں تو کوئی کہیں ایسا آئینا نہ ملا



کسی آذر کسی تیشے سے سنوارا نہ گیا
سنگِ دل میں کسی شکل میں ڈھالا نہ گیا



دل کو چھو کر کون یہ گزرا
تم تھے یا خوشبو کا جھونکا

اس کا آنخپل میلا میلا
کس افسانے کا ہے ٹکڑا

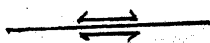
جلتا گھر تو سب نے دیکھا
کون جلا یہ کس نے پوچھا

جھانک رہا ہے ہمسائے سے
ایک بدن کچھ سٹاسٹا

کس کس کو خون اپنا بانٹوں
ہر اک جیسے خون کا پیاسا

رستے سب سنان پڑے ہیں
اک پھرتا ہے قاتل تنہا

اس کا روپ علی کیا کہئے
جیسے کوئی گیت کا مکھڑا



سانولے رُخ پہ بال بکھرے تھے
میں یہ سمجھا دھواں دھواں ہے شام



ہنگامہ نشاط نہ طوفانِ حادثات

سوئی پڑی ہے حد نظر تکِ حیات

رفقار کیا ہے وقت کی یہ ہم سے پوچھئے

چلتے ہیں یکے ہاتھ میں ہم نفسِ کائنات

اک عمر ساتھ رہتے ہوئے ہو گئی مگر

پہچانتی نہیں ہے ابھی تک مجھے حیات

چہرے کی ہر کیر ہے تحریرِ درد کی

دل کا ہر ایک زخم ہے عنوانِ اُردات

سورج ابھر چکا بھی، سحر بھی ہوئی مگر

بستر کی ہر شکن سے ابھی جھانکتی ہے ات

شیشے سے بھی سوا میں نزاکت میں اے علی

مرمر کے پیکرِ دل میں تراشے تخیلات



پھول برسے کبھی ہر سمت سے پتھر آئے
حادثے روز نیا روپ بدل کر آئے

بات کیا ہے کہ بھٹکتا رہا جس راہ پر میں
آپ بھی راہ بھٹک کر وہیں اکثر آئے

کھول دو بال تو جاتا ہوا سادہ رک جائے
مسکرا دو تو چین دُور سے چل کر آئے

ہوں تو قطرہ ہی مگر ظرف کا عالم یہ ہے
تشنگی اپنی بجھانے کو سمن در آئے

دُور بھاگوں تو وہ سایہ کی طرح سا تھہرے
راہ روکوں تو خیالوں سے گزر کر آئے

اور تو رہ گئے سب چھوٹ کے راہوں میں مگر
حادثے میرے تعاقب میں برابر آئے

بادلوں تم کو برسنا تھا مرے کھیتوں پر
فائدہ کیا جو چٹانوں پہ برس کر آئے

اے علی درد کا رشتہ بھی عجب رشتہ ہے
چوٹ ان کو لگے زخم اپنے بدن پر آئے



فریبِ نکہت و گلزار سے بچاؤ مجھے
کرم کرو کسی صحرائے چھوڑاؤ مجھے

وہ جنس ہوں میں جسے یک کے مد میں گزریں
جو ہو سکے تو کہیں سے خرید لاؤ مجھے

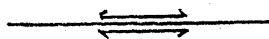
میں کون ہوں مجھے چہرہ بھی اپنا یاد نہیں
کہیں سے لاکے، کوئی آئیٹم دکھاؤ مجھے

کسی پہ اپنے سوا اب نظر نہیں پڑتی
مری نگاہ سے لے دو ستو چھپاؤ مجھے

پچل رہی ہے نظر چھو کے دیکھئے اس کو
سمٹ رہا ہے بدن ہاتھ مت لگاؤ مجھے

وہ لاش راہ سے جس کو اٹھا کے لائے ہو
کہیں وہ میں تو نہیں ہوں ذرا دکھاؤ مجھے

بکھر چکا ہوں علی میں غزل کے شعروں میں
بساطِ عارض و لب سے سمیٹ لاؤ مجھے



تجھ سے ہر جاتی کو لفظوں میں سمونے کیلئے
کتنے آوارہ خیالوں کو سمیٹائیں نے





رات بادل جو تری زلف کا پھیلا ہوگا
کون جانے ہے کہاں ٹوٹ کے برسا ہوگا

تیرے بخشے ہوئے زخموں کا عجب عالم ہے
اس لطافت سے کوئی پھول نہ مہکا ہوگا

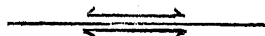
ساری دنیا پہ چھڑک دوں نہ اُجالے تو سہی
میری مٹھی میں کسی دن تو سویرا ہوگا

چھوڑیئے بات ہماری شب تنہائی کی
آپ کا دل بھی تو کچھ دیر کو دھڑکا ہوگا

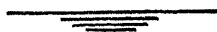
اپنے گلشن ہی میں مجرم کی طرح پھرتا ہوں
کیا خبر تھی کہ ہر اک پھول پہ پہرا ہوگا

جسکی بوندوں کو ترستے رہے گلشن اپنے
رنگزاروں پہ وہ بادل کہیں برسا ہوگا

اے علی جسکی تیا ہی پہ ہنسے تھے ہم بھی
کیا خبر تھی کہ وہ اپنا ہی سفینا ہوگا



نظروں سے جب پڑھا تو گماں اور ہی ہوا
ہاتھوں سے جب چھوا تو بدن تھا الہو لہو





ملی حیات تو ڈالے ہوئے نفتاب ملی
 کھلی ہوئی نہ کبھی ہسم کو یہ کتاب ملی
 تمہارے شہر کے وہ میکدے تھے یا مقتل
 جہاں رگوں سے پھوڑی ہوئی شراب ملی
 وہ یاد جس کو کہیں دور چھوڑ آئے تھے
 پلٹ کے پیچھے جو دیکھا تو ہم کتاب ملی
 جہاں سے لوگ اُجالے سمیٹ لائے تھے
 ہمیں وہاں سے فقط گردِ آفتاب ملی

وہ آرزو جسے ہم ڈھونڈتے رہے برسوں
 خیال و خواب کے سائے میں خواب ملی



کون اس سمسے گزرا ہے شراروں کی طرح
رہگزر مہیر چمکتی ہے ستاروں کی طرح

کیا کسی شہر تمنا کی حدیں پہنچیں
خوبصورتی سے ہر اک موڑ نگاروں کی طرح

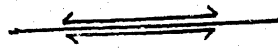
ہائے وہ جسم جو کل تک تھے غرورِ گلشن
آج پامال ہیں مے لے ہوئے ہاروں کی طرح

کاش طوفان ہی بن کر وہ ادھر آنکلیں
ہم ہیں کھولے ہوئے آغوش کناروں کی طرح

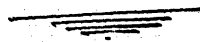
آج بھی درد کے صحرا میں بھٹکتی ہے حیات
 پیچ و خم کھائی ہوئی راہ گزاروں کی طرح

کون اس دائرۂ شوق سے باہر نکلے
 خواہشیں گھیر کے بیٹھی ہیں حصاروں کی طرح

نقشِ پا اپنے مٹانے سے علی مٹ نہ سکے
 پھر اُبھر آئے ہیں ڈوبے ہوئے تاروں کی طرح



بادل کے انتظار میں کتنی اُداس ہے
 وہ سرزمین کہ دفن بہاں میری پیاس ہے





کون یہ آیا برا فگندہ نقاب
 بچھ گئے آنگن میں میرے آفتاب

دل تک اڑ کر اُس کے ذرے آئے ہیں
 گر کے ٹوٹا ہے کہیں جامِ شراب

میرے ماتھے کا لکھا پڑھ لیجئے
 میں ہوں خود اپنے سوالوں کا جواب

کونٹے ہیں یہ مفت ماتِ سفر
 اپنا سا یہ بھی نہیں ہے ہم کاب

آئی ہے خوشبو تمہارے لمس کی
جب کبھی کھولی ہے پڑھنے کو کتاب

دیتے ہیں گل کی بہاروں کا پتہ
آج کے سوکھے ہوئے برگِ گلاب

وقت کے ہاتھوں نے بڑھ کر اے علیؑ
نوج پھینکے کتنے چہروں کے نقاب

فرشِ گل سے بھی یوں گزرتا ہوں

جیسے کانٹوں پہ پاؤں دھرتا ہوں



چاند سورج کی نگاہوں سے چھپاؤ مجکو
تیرگی ہوں میں اُجالے میں نہ لاؤ مجکو

کون ہوں کیا ہوں میں آئینہ دکھاؤ مجکو
میں بھی دیکھوں تو ذرا سامنے لاؤ مجکو

ٹوٹنے میں ہے جولّت وہ بکھرنے میں کہاں
فرش گل پر نہیں پتھر پہ گراؤ مجکو

خاک اُڑائی تھی جہاں اہل حین نے میری
لے چلو پھر وہیں اکبر ہواؤ مجکو

قتل گاہوں کی مجھے راہ دکھانے والو
پہلے الزام ہے کیا یہ تو بتاؤ مجکو

زخم سمٹے ہیں کہ رسوا نہ سرِ مخمل ہوں
اشک چلے ہیں کہ پلکوں پہ سجاؤ مجکو

آج ہر سر پہ لٹکتی ہوئی تلواریں ہیں
زندگی چسیخ رہی ہے کہ بچاؤ مجکو

جو دکھاتے ہیں علی سب کو نشانِ منزل
میں وہی نقش قدم ہوں نہ مٹاؤ مجکو



وہی ہے کل کے اندھیروں کا سناٹا اب بھی
کہیں ہے جیسے اُجالا اُڑکا ہوا اب بھی

وہ بال کھولے کبھی اس طرف سے گزرے تھے
تھک رہا ہے مرے دل کا رستا اب بھی

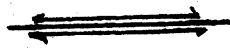
وہ آگئے مری سانسوں سے بھی قریب مگر
دل و نگاہ میں باقی ہے فاصلہ اب بھی

جہاں جہاں ہے چلن آپ کے چہراغوں کا
وہاں وہاں ہے اندھیرا بڑھا ہوا اب بھی

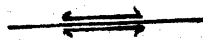
لبوں پہ عشرتِ امروز کی غزل لیکن
نظر میں دورِ گزشتہ کا مرثیاب بھی

بجھایجھا ہی سہی دلِ غریب کا لیکن
نہ جانے کتنے گمروں کا ہے یہ دیا اب بھی

جس آئی نے کو علی توڑ کر میں نکلا تھا
قدم قدم پہ اسی کا ہے سنا اب بھی



اب تو آنچل کی اوٹ سے بھی علی
وقت کی دھوپ چھن کے آتی ہے





پیار کرتا ہوں میں سزا دیدو
مجھ کو جینے کی بددعا دیدو

حادثے میری سمت آتے ہیں
دور ہٹ جاؤ راستا دیدو

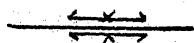
چھین لو مجھ سے یہ محل میرے
سانس لینے کو کچھ ہوا دیدو

تشنگی ہے ہماری صحرا کی
مے نہیں ہٹم کو میکدا دیدو

جھانکتے ہیں جو سب کے چہروں میں
ان کے ہاتھوں میں آئینا دیدو

چاند سورج تراشنے والو
ہم کو بھی روشنی ذرا دیدو

ہیں جو برتے ہوئے خیال علی
پیرہن اُن کو تم نیا دیدو



یہ جو سایوں میں آج جلتے ہیں
دھوپ سے ڈر کے بھاگ آئے تھے





ہے ترے شہر کی یہ رسم عجیب
سب کچے ہاتھوں میں ہیں نشان صلیب

جیسے اپنا وجود کھو بیٹھے
پھول آکر ترے بدن کے قریب

اُف یہ میرا جنونِ تشنہ لبی
یوں نہ آؤ شراب بن کے قریب

دل نے کھولی ہے آنکھ ظلمت میں
روشنی میں بھٹک نہ جائے غریب

اپنا چہرہ وہ کیسے پہچانیں
 آئینے بھی جنہیں نہیں ہیں نصیب

جیسے ٹھہرا ہوا ہے ہر لمحہ
 زندگی کا ہے یہ مقام عجیب

ہے بڑی چیز درد کا رشتہ
 جس کو دیکھو وہی لگے ہے حبیب

لیجئے اے علی قدم بڑھ کر
 تیرگی لائے ہیں سحر کے نقیب



اشک کی بوند کو پلکوں پہ سجائے رکھتے
ہے غنیمت یہ چراغ اس کو جلائے رکھئے

کون مظلوم تم اس شہر میں معلوم تو ہو
اپنے ہاتھوں میں صلیبوں کو اٹھائے رکھے

زلف کی چھاؤں بڑی چپیز ہوا کرتی ہے
اس اندھیکے کو اجالوں سے بچائے رکھئے

کل کے حالات کا کیا جانے تقاضا کیا ہو
پھول کے ساتھ ہی تپھر بھی اٹھائے رکھئے

کیا خبر کب کوئی آوارہ گھٹا آبر سے
آپ پیاسے ہیں تو پیاس اپنی بڑھائے رکھئے

ٹھہرے میں اسے لفظوں کا بباوہ دیدوں
لی ہے انگریزی تو پھر ہاتھ اٹھائے رکھئے

کم نہیں سُرخی گلشن سے لہو کی رنگت
زخم کے پھول سہی پھول کھلائے رکھئے

جوہری کوئی تو بازار میں آنکھ لگا
آپ قیمت تو علی اپنی بڑھائے رکھئے



لے چلو ہاتھ میں لوگو تھپسہ
ہیں بہت راہ میں شیشوں کے نگر

کوئی دیوار نہ سایہ نہ شجر
دھوپ ہی دھوپ ہے تاحد نظر

زندگی تھی کہ صبا کا جھونکا
اڑ گئی پھول کی خوشبو بن کر

لوگ سورج میں نہا بھی آئے
ہم اُلٹتے رہے اوراقِ سحر

وہ عبارت جو کتابوں میں نہ تھی
ہم نے چہروں میں پڑھی ہے اکثر

کس قدر فاصلے بڑھ جاتے ہیں
دو قدم دیکھئے تنہا چل کر

ہم سے عارض کی لطافت پوچھو
ہم نے دیکھے ہیں یہ شعلے جھوکر

ساتھ دیتے نہیں الفاظ علی
کس طرح طے ہو خیمالوں کا سفر



ہم شہر میں تھے یا کسی صحرائے میں پڑے تھے
سائے بھی وہاں ہم سے بہت دور کھڑے تھے

کو تازہ بہت اُن کے خیالات کا قد تھا
کچھ لوگ جو قامت میں بہت ہم سے بڑے تھے

کشتی کسی معصوم کی جب ڈوب رہی تھی
یہ سچ ہے کہ ہم آپ کنارے پہ کھڑے تھے

دی مصلحتِ وقت نے احساس کی پستی
اُن کو جو صلیبوں کی بلبندی پہ چڑھے تھے

ملتی بھی کہاں دھوپ سے بچنے کو پناہیں
دیکھا تو کبھی اپنے ہی سائے میں کھڑے تھے

اسلوب نیا دے کے اٹھالائے ہم ان کو
فرسودہ خیالات جو بیکار پڑے تھے

کیا بھیڑ تھی اُس شہر کی راہوں میں نہ پوچھو
کچھ لوگ تو خود اپنے ہی سائے میں کھڑے تھے

آج اس سے سُکتی ہیں عسلی زہر کی بوندیں
جس شاخِ تمنا سے کبھی پھول جھڑے تھے



دھوپ سے بھاگے تو ہم کو کیا ملا
گردشِ ایام کا سایا ملا

کیا کروں لے کر کتابِ زندگی
جو ورق اُلٹا وہی سدا ملا

کون دستک دے گیا کیا جائے
در پہ خوشبو کا بس اک جھونکا ملا

سب کے لب پر اپنے غم کی بات تھی
میرے غم کا کس کو اندازہ ملا

ہم بڑی اُمید لے کر آئے تھے
تو بھی اے بادل ہمیں پیسا ملا

شہرِ غم میں کوئی بیگانہ نہ تھا
سب سے اپنے درد کا رشتا ملا

ہم تعارف کھیلے بے چین ہیں
آنکھ تو بھی ہر دم اے دنیا ملا

اپنے آنسو پوچھنے کے واسطے
ہم کو دامن خود علی اپنا ملا



موسم گل ابھی اے جانِ چمن باقی ہے
تو نہیں ہے تری خوشبوئے بدن باقی ہے

ہو گئی دُور لباسوں کی شکن تو لیکن
روح و تن پر جو پڑی ہے وہ شکن باقی ہے

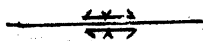
خونِ مظلوم کے چھنٹے در و دیوار پہ ہیں
آج بھی سلسلہ دار و رسن باقی ہے

خشک ہونٹوں پہ تبسم کی کرن ہے لیکن
دل کے بازار میں زخموں کا چلن باقی ہے

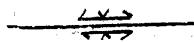
لوگ کیوں لاش اٹھائے لئے جلتے ہیں مری
کیا ابھی اس میں کوئی تارِ کفن باقی ہے

دور آئے گئے کتنے مگر اے ارضِ دکن
تیرے چہرے کا وہی سانپ باقی ہے

ہو گئی عام روایتِ شیکنی جب سے علی
شعر باقی ہے نہ وہ شعرِ کفن باقی ہے



مہتاب پر نہ آنکھ مری آفتاب پر
میری نظر ہے اسکی بدن کی کتاب پر





اڑی اڑی ہوئی رنگت بچھے بچھے تیور
یہ زندگی ہے کہ مسلی ہوئی کوئی چادر

بھرے نہیں ہیں ابھی زخم آفتابوں کے
ہے گرد گرد اچالا 'دھواں دھواں ہے سہم

یہ گیسوؤں کی گٹھا ہے کہ رات ساون کی
یہ چاندنی ہے بدن کی کہ تاج کا مرمز

نہ جانے کتنی یہاں حسرتیں ہیں خوابیدہ
نسیم صبح دے پاؤں اس طرف سے گزر

بس آگیا تھا ذرا اس کے پیر ہن کا خیال
گزر گئی کوئی خوشبو قریب سے ہو کر

ابھی گناہ میں وہ باتیں نہیں آیا
حیات شوق ذرا اور سچ کچھ اور نکم

سحر کی گود کے پالے ہوئے ہیں ہم لیکن
یہ اور بات کہ پہچانتی نہیں ہے سحر

علیٰ ہمیں نے پکارا نہیں اُسے درتہ
حیات دور تلک — دیکھتی رہی مڑ کر



اس شہر میں دیکھوں جسے اپنا سا لگے ہے
ہر شخص سے جیسے کوئی رشتہ سا لگے ہے

حالات کی اس بھیڑ میں امید اکیلی
صحرا میں کسی پیڑ کا سایا سا لگے ہے

سوچو تو وہ اک ساز کا چھیرا ہوا نغمہ
دیکھو تو وہ اک گیت کا مکھڑا سا لگے ہے

یہ کیسے ہیں بادل کہ برستے تو ہیں لیکن
پیا سا مرا کھیت آج بھی پیا سا سا لگے ہے

پہنچی یہ کہاں لیکے مجھے تیری تمنّا
دنیا کسی افسانے کا ٹکڑا سا لگے ہے

مدت ہوئی تم ہاتھ چھڑا لے گئے لیکن
وہ عمر کا لمحہ ابھی ٹھہرا سا لگے ہے

کمرے کے دریچوں پہ تیری یاد کی دستک
جھکو کسی پروانی کا جھونکا سا لگے ہے

ہو زخم مجھے اپنے رفیقوں سے ملا تھا
وہ زخم علی آج بھی تازہ سا لگے ہے

اب یہی ہر آدمی کی بات ہے
یہ تہی دامن وہ خالی بات ہے

آئینے الفاظ کے دھند لا گئے
ان سے لپٹی گردِ محسوسات ہے

سرمہ اتے آنچلوں کی چھاؤں میں
پرسکوں کیا گردِ دُشِ حلاّت ہے

آنکھ سے آنسو ابھی ٹپکے نہیں
راہ میں ٹھہری ہوئی برسات ہے

کر رہا ہوں ہر نفس کا یوں شمار
زندگی جیسے کوئی خیرات ہے



وقت کی دھوپ سے بچنے کا مداوا بھی نہیں
 زلف کی چھاؤں تو کیا دار کا سایا بھی نہیں
 لوگ کیوں جامِ تہی لیکے بڑھے آتے ہیں
 ابھی پیمانہ مری آنکھ کا چھلکا بھی نہیں
 فاصلہ ہاتھ کا خود ہم نے بڑھا رکھا ہے
 ورنہ دامن وہ بہت دور ہوا یا بھی نہیں
 یہ نہیں جھوٹ کہ ہر بار تجھے دیکھا ہے
 یہ بھی سچ ہے کہ ابھی تک تجھے دیکھا بھی نہیں
 ہر طرف سے مجھے آئینہ دکھائے ہیں سرِ آ
 منہ چھپانے کیلئے دامنِ صحرا بھی نہیں
 آہ سے اس کی مرے شعر پگھلتے ہیں علی
 اُف وہ پیکر کہ جسے ہاتھ لگایا بھی نہیں



کوئی شیشہ ہی ہاتھ سے چھوٹے
یہ بھیانک سکوت تو لوٹے

یہ تو سنان راستے جانیں
وقت نے کتنے کارواں لوٹے

جلتی لاشوں کی روشنی ہی سہی
ظلمتوں کا غرور تو لوٹے

جوا اٹھائے ہوئے صحیفے ہیں
دے رہے ہیں وہی بیاں جھوٹے

چاند سورج بکھیرنے والو
اس طرف بھی کوئی کرن بھوٹے

طرزِ نوائے عسلی بجا لیکن
فن کا دامن نہ ہاتھ سے چھوٹے

مزارِ طنز کا ہر اک سخن میں کتنا تھا
شعور آپ کے دیوانہ پن میں کتنا تھا

یہ بات اور زمین لالہ زار ہم سے ہے
وگر نہ خون ہمارے بدن میں کتنا تھا

ابھی تک مرے ہاتھوں کا لمس ہیکے ہے
نہ جانے عطر ترے پیرہن میں کتنا تھا

ہے زخم زخم و قہر آج شاہراہوں پر
کبھی وفا کا چلن اس دکن میں کتنا تھا

علی کا نام جو اب اجنبی سا لگتا ہے
کبھی یہ نام تری انجمن میں کتنا تھا



بات اب تک جو تھی پردہ داروں کے بیچ
بات رکھ دی وہ ہم نے ہزاروں کے بیچ

زندگی اور یہ دھوپ حالات کی
جیسے ندی بہہ ریگزاروں کے بیچ

پیار کی آہ میں تپ رہے تھے ہیں
آپ کیوں آگئے ان شراروں کے بیچ

یوں بھٹکتے ہیں ماضی کی گلیوں میں ہم
جیسے چلتا ہو کوئی مزاروں کے بیچ

اور تھے وہ جو دھوکے میں مارے گئے
ہم تو لوٹے گئے اعتباروں کے بیچ

آج حالات کے موڑ پر ہم علی
بے سہارا ہیں کتنے سہاروں کے بیچ



تمام عمر پتھیلی میں سنسنا رہا ہے
 وہ ہاتھ ہاتھ میں آکر جو چھوٹ جاتا ہے
 نگاہ و دل کے دیے تو کھول کر رکھوں
 اسی طرف وہ دبے پاؤں کوئی آتا ہے
 سمو کے جس میں چٹانوں کا عزم رکھتا ہوں
 وہی خیال کبھی چھین سے ٹوٹ جاتا ہے
 بڑے سکون سے سر رکھ کر میری چوکھٹ پر
 نہ جانے وقت کہاں کی تھکن مٹاتا ہے
 وہ سپاہِ روز اندھیرے ڈھونڈتا ہے مجھے
 جو روشنی میں مرے ساتھ ساتھ آتا ہے
 شعورِ فکر مر اسنگ و خشت سے بھی علی
 خیال و خواب کے پیکر تلاش لاتا ہے



یہ کس مقام پہ پہنچی ہے لیکے بے وطنی
نہ رنج جامہ دری ہے نہ فکر بے کفنی

ترے دیار سے نکلے تو دھوپ سا تھپہلی
کہیں ملی نہ ہمیں گیسوؤں کی چھاؤں گھنی

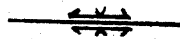
یہ بد نصیب ہیں ان پر بہائیے آنسو
دیا ہے ان کو وطن نے پیامِ بے وطنی

مہکتی زلف سے رخسار و لب سے آنچل سے
کہاں کہاں سے چھنی ہے تمہاری گل بدنی

قدم قدم پہ ہو بکھری ہوئی غزل جیسے
یہ رنگ رنگ قبا میں یہ تنگ پیرہنی

مہکے سایے زمانے کو جس نے نچستے تھے
ہمارے حق میں وہی شائع گل صلیب بنی

بہت لطیف و سبک شاعری کا فن ہے علی
یہ کارِ شیشہ گری ہے نہیں ہے سنگ زنی



نام روشن کیا سویروں کا
کیجئے احتام اندھیروں کا

نظمیں

- شہر سخن
- نیادور
- ٹوٹے تارے
- فاصلہ
- سنگ میل
- مشاہدہ
- یہ رات
- اندھیرے
- ٹھنڈی کرن

ساتھ دیتے نہیں الفاظ علی
کس طرح طے ہو خیالوں کا سفر

شہرِ سخن

یہ کس شہرِ سخن میں آگئے ہم
 یہاں حدِ نظر تک ایک ویرانی سی ویرانی
 درستیجے بند بام و درہیں خالی
 جھروکوں میں ہے سناٹا
 کہیں بھی رسمِ ولداری نہیں ہے
 محبت کا یہاں اظہار ہے جرم
 حدیثِ گیسو و رخسار ہے جرم
 خیالوں کے شبستاں بند کر دو

کوئی خوشبو کا جھونکا آئے جائے
کوئی آواز پیا چو نکا نہ جائے

یہ کس شہر سخن میں آگئے ہم
یہاں چلتا ہے سگہ کج روی بے اعتدالی کا
چلن ہے کھر درے پن کا
یہاں اکھڑا ہوا لہجہ سندھ کا ہونے کی
نئے معمار ہونے کی

یہ کس شہر سخن میں آگئے ہم
یہاں احساسِ تنہائی بہت ہے
یہاں ہر شخص اپنی ذات میں بکھرا ہوا ہے
یہاں لفظوں کے چہرے مسخ ہیں
ترسیلِ ممنوعہ شجر
ابلاغِ بے معنی
پرانی ہو گئیں یہ اصطلاحیں

کھڑی ہیں راستہ روکے
فصلیں

چھیستاں، ابہام، ژولیدہ بیانی کی

یہ کس شہرِ سخن میں آگئے ہم
یہاں ہر قید سے ہے فکر آزاد
یہاں ملتی ہے فن کے قتل کی داد
فشکست و ریخت کا یازار ہے گرم
پڑے ہیں جا بجا طبع کلاسیکی روایت کے
ہے چلنا دو قدم مشکل
یہ کس شہرِ سخن میں آگئے ہم

نیا دور

آیا دور نیا
 بیٹے عہد کی لاش کو اپنے پاؤں تلے
 روندنا آیا دور نیا
 اور نیلے آکاش کی پگڈنڈی سے اتری
 صبح نئی

لے کر اپنے قدموں میں مٹی لے سویرے
 دورِ افق کی دیواروں سے ابھرا سورج
 وقت کی سیرٹی پر پڑھتی ہے
 دھوپ نئی

بیت گیا اک دور سفر اک ختم ہوا
 جانی پہچانی سب راہیں چھوٹ گئیں

اور نظر کی پہنائی تک پھیلے ہیں
 بیگانے، انجانے رستے
 ان رستوں کی ننگی چھاتی پر
 کیا جانے

کتنے اندھیرے راہ ہماری دیکھ رہے ہیں
 کتنے ناگ ہمیں ڈسنے کو
 منہ کھولے بیتاب کھڑے ہیں
 کیا جانے

کتنے اجالے راہ ہماری دیکھ رہے ہیں
 کتنوں کے چہروں پر شفق کی لالی لیگی انگریزی
 کتنوں کے اراٹوں کے کھیتوں میں سرسوں پھونگی
 یا شعلوں کی فصل اُگے گی
 یا بادل پھلوائی پر منڈلائیں گے
 یا برسیں گے صحراؤں کی گود میں
 یا چٹانوں پر •

ٹوٹے تارے

میں نے کل رات
آسمان سے ٹوٹ کر گرتے ستارے دیکھ کر
اپنا دامن تہی پھیلا دیا بڑھ کر — مگر
کچھ توان میں سے خلاؤں میں بھٹک کر رہ گئے
اور کچھ تو

ایسے دامانوں میں آکر گر پڑے
تھکے جو پہلے ہی شہابیوں سے بھرے
اور کچھ

گر کر زمین پر بچھ گئے
میرا دامن تہی خالی کا خالی ہی رہا

فاصلہ

تری آنکھوں میں تھے مستی کے ڈورے
 مہکتے تھے ترے رخسار گل تک
 لگاوٹ تیرے ہر انداز میں تھی
 غضب تھا حسن کا اظہار گل تک
 مقابل آئینہ رہتا تھا تیرے
 جوانی تھی تری بیدار گل تک
 بلائی تھی مجھے کس نغمگی سے
 ترے پاؤں کی جھنکار گل تک

نہ رہتی تھی کبھی پھولوں سے خالی
 یہ تیری زلفِ عنبر بارِ گل تک
 جدالب سے نہ ہوتا تھا تبسم
 رسیلی تھی تری گفتارِ گل تک
 قیامت تھی تری رنگین مزاجی
 لبوں پر تھے مرے اشعارِ گل تک
 مرے شانے پہ خم رہتی تھی پہروں
 تری گردن صراحی دارِ گل تک

مگر اک عمر کی دیوارِ جب سے
 ہمارے بیچ حائل ہو گئی ہے
 مجھے محسوس یوں ہوتا ہے جیسے
 کہ تو ہاتھوں سے میرے کھو گئی ہے
 سنورنے کی نہیں اب تنگ و فرست
 سجادِ بات جیسے دور کی ہے

نہیں باقی وہ احساس جمال اب
 سنہری جلد مسیلی ہو گئی ہے
 ترے ماتھے پہ وہ جو چاندنی تھی
 بکھڑوں کی روا میں چھپ گئی ہے
 تبسم کے شرارے ہیں بجھے سے
 شفق ہونٹوں کی پھیسکی پڑ گئی ہے
 شکن آلود سپیرا ہن ہے تیرا
 ترے آنچل کی حالت ملگبی ہے
 ہیں سوکھے پال بے ترتیب تیرے
 ادا لکھی نظر لکھی ہوئی ہے
 وہ خوشبو اب کہاں تیرے بدن کی
 کسی گوشے میں جا کر سو گئی ہے
 یہ کیسا فاصلہ یہ کیسی دوری
 مری ہو کر بھی اب تو اجنبی ہے

سنگِ مہل

رات بگھلی آفتاب ابھرا
 افق کے لبِ سنہرے ہو گئے
 چھوڑ کر تاروں کا سیج اٹھی سحر
 بھوئی مگر

پھڑپھڑائیں ظلمتیں زخمی پرندوں کی طرح
 اور ان کے جسم سے ٹپکی ہوئی ایک ایک بوند
 بن گئی عنوانِ مری تاریخ کا

ٹوٹ کر برسی گھٹا

بجھ گئی صدیوں کی پیاس
 ٹوٹ کر قدموں میں بکھری کھکشاں
 بن گئے ذرے چراغ
 فاصلے کم ہو گئے
 منزلِ دار و رسن طے ہو گئی

لیکن اے میرے رفیقو! ہم جلیسو! ہمدمو!
 کیا یہی وہ سرزمینِ آرزو ہے
 کیا یہی ہے وہ افق کے پار کی بستی
 جسے خوابوں کی وادی میں بسا رکھا تھا ہم نے
 آج تک

یہ وہ منزل ہی نہیں جس کے لئے نکلے تھے ہم
 یہ تو ہے اک سنگِ میل

مشاہدہ

ہم نے ایسی ہنسی بھی دیکھی ہے
 جس سے اُرتی ہے درد و کرب کی دھول
 جو نقیب طرب — نہیں ہوتی
 اور دیکھے ہیں ایسے آنسو بھی
 جن سے خونِ جگر نہیں رستا
 جو سفیرِ نشاط ہوتے ہیں

ہم نے ایسے بھی پھول دیکھے ہیں
 جن سے دل کو سکون نہیں ملتا
 جو مہکتے نہیں کھٹکتے ہیں
 اور ایسے بھی خسار دیکھے ہیں

کام آتے ہیں جو مصیبت میں
بڑھکے دامن جو تھام لیتے ہیں

ہم نے ایسے بھی دیکھے ہیں یاد دل
جن کو کھیتوں سے بے بس ہونا ہے
جو سمندر پہ جا برکتے ہیں
اور ایسے بھی کھیت دیکھے ہیں
جن کی مٹی سے بھوک اگتی ہے
جو کسی کا شکم نہیں بھرتے
ہم نے ایسی بھی شمع دیکھی ہے
جس کا گٹھ جوڑ ہے اندھیروں سے
تیرگی اور جو بڑھاتی ہے
اور ایسی بھی رات دیکھی ہے
جس کی انجم بدوش تاریکی
پردہ پوشِ غماہ ہوتی ہے

پیر رات

میری ساتھی، مری شریکِ حیات
 اک ذرا اور پاس آجاؤ
 آج کی رات ہے سہاگ کی رات
 اور اس حجلہٴ عرسِ دوسی میں
 میں ادھر بے قرار بیٹھا ہوں
 سمٹی سمٹی اس طرف تم ہو
 دور تک غامشی سی چھائی ہے
 اور مہکا ہوا ہے سناٹا

میری ساتھی، مری شریکِ حیات
 اک ذرا اور پاس آجاؤ
 رات کی عمر مختصر ہے بہت
 آؤ اس کو بچو ڈاکر پی لیں

آج تم میری بن کے آئی ہو
 لیکے باراستہ آرزوؤں کی
 دل کی دھڑکن چھپاے چھاتی میں
 ہاں اسی واسطے تو کہتا ہوں
 اک ذرا اور پاس آ جاؤ
 تاکہ آنچل ہٹا کے مکھڑے سے
 آج اس کے گھنے اجالوں میں
 اپنے جذبات کی سحر کر لوں
 رخ پہ بکھرا کے عتبریں زلفیں
 اپنی سانسوں میں روشنی بھر لوں

میری ساختی، مری شریکیت
 اک ذرا اور ادھر سرک آؤ
 آج جی بھر کے دیکھ لوں تم کو
 سرخ ڈورے مہناری آنکھوں کے
 تہمتا ہت تہہارے گالوں کی

دست و بازو کی چمبی رنگت
 آج کے بعد یہ کنورا روپ
 پھر ملے گا نہ دیکھنے کے لئے
 کچھ دنوں بعد یہ نکھار یہ جسم
 وقت کی گرد کے دھندلوں میں
 رنگ روپ اپنا سارا کھو دے گا
 اور آلام روزگار کی دھوپ
 گھر کے آئین میں پھیل جائے گی
 میری ساختی، مری شریک حیات
 اک ذرا اور پاس آجاؤ
 وقت کو آؤ آج ٹھہرا لیں
 آرزوؤں کو آج دہکالیں
 پی کے رس ایک ایک لمحہ کا
 آج کی راست کو امر کر لیں
 ہاں اسی واسطے تو کہتا ہوں
 اک ذرا اور پاس آجاؤ

اندھیرے

یہ نکلے نکلا تھا میں افکار کی جلتی مشعل

چاہتا تھا کہ اندھیروں کو جلا کر رکھ دوں

تو رُدوں ان کا غرور

چھین لوں رات سے اس کا افسوس

اس کے آنکھوں میں سویروں کی ازاں دوں لیکن

میں نے دیکھا

کہ یہ بیدار دیہے رحم اندھیرے بے خوف

میرے قدموں کی طرف رہینگے بڑھتے ہی چلے آتے ہیں

کالے سانپوں کی طرح

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس رات کی چادر کی تہیں

ہو گئیں اتنی گھنی، اتنی دبیر

کہ مری فکر، تخیل میرا دونوں

منہ کے بل گر پڑے کھا کر ٹھوکر

جاگری دور کہیں

ہاتھ سے چھوٹ کے افکار کی جلتی مشعل

ٹھنڈی کرن

آف یہ برسات میں ایک بھیکا بدن
 اوس میں جیسے لپٹی ہو ٹھنڈی کرن
 ایک برفیلا شعلہ پگھلتا ہوا
 اک لطافت کے ساگر میں ڈوبا چمن
 یاد لوں میں تڑپتی ہوئی بجلیاں
 جھیننی ساری سے چھٹے خطوط بدن
 سرخ عارض سے انگارے لپٹے ہوئے
 آگ پانی کا ہوتا ہو جیسے ملن
 مرمی جلد کی دودھیا چاندنی
 ترشے پیکر کا نکھرا ہوا بانکسین

روپ دعوت گناہوں کی دیتا ہوا
 رس چواتے ہوئے رس سے بوجھل نہیں
 کومل انگوں سے بوندیں ٹپکتی ہوئی
 جیسے ساغر سے چھلکے شراب کہن
 گورے ماتھے پہ اوشا کی انگڑائیاں
 چکنے گالوں پہ کھلتے گلاب و سمن
 فوجوانی کا سوتا پگھلستا ہوا
 جیسے برکھا کی رُت میں چناروں کا بن
 لال ہونٹوں پہ صدقے شفق کا لہو
 بھیجے چر فوں پر قریان گنگ۔ وِجمن
 چال جیسے ندی ایک چڑھتی ہوئی
 بال جیسے کہ کا جہل کا دھویا گنگ
 رس بھری جیسے ٹھمری کوئی یا غزل
 اُف یہ برسات میں ایک بھیگا بدن

پریاس

دور افق کے گوشوں تک

پھیلا ہے سمندر

حد نظر تک پانی ہی پانی

لیکن

میں ساحل پر پیاسا ہوں

صدیوں کی ہے پیاس میری

کیا تم

اپنے آنسو بھی دو گے نہ مجھے

پینے کے لئے •

لہو

آج بھی میرا لہو تازہ ہے

جیسے ٹپکا ہوا بھی

اور اس ٹپکے ہوئے خون کے

ہر قطرہ سے

آج بھی بوسے وفا آتی ہے •

غزلیں



دردِ دل اس میں سلیقہ سے ادا ہوتا ہے

تبصرہ بعد میں بھی قتل پہ ہو سکتا ہے
 پہلے پہ لاش تو رستے سے ہٹا دی جائے



ان کے ہونٹوں سے چن کر گلاب و سمن
ہم تے توڑا ہے اکثر غرورِ تہن

تیرے دامن کی خوشبو سیٹے ہوئے
آج تک — میرے بستر کی ہے ہر ٹسکن

ایسے لوٹے گئے ہم ترے شہر میں
ہو گئی ہر منتِ غریب الوطن

زندگی کل عبارت — اجالوں سے تھی
زندگی آج ہے ایک — میلہ کفن

اپنی تنہائیوں کو لئے دوش پر
کوئی پھر تارہا انجمن انجمن

تازگی جیسے ان کا مقدر نہیں
سب کے چہروں پہ ہے زندگی کی تمن

آج پلٹے ہیں حالات کی گرد میں
کل جو ہوتے تھے چھوٹے سے میلے بدن

ہم نے تلخی چھپالی علی شہر کی
دیکھ الفاظ کا خوشنما پیرہن



کوئی جھوٹکا جو دے پاؤں چلارات گئے
مجھ کو دھوکا ترے قدموں کا ہوارات گئے

آ کے پلکوں پہ کوئی اشک ر کارات گئے
اک چراغ اور سر بزم جلا رات گئے

دامنِ صبح میں بجھتے ہوئے تاروں کی طرح
کسی بیمار نے دم توڑ دیا رات گئے

دیکھنے کے لئے عالم تری انگڑائی کا
رک گیا وقت بھی کچھ دیر ذرا رات گئے

ان کے ہونٹوں پہ ہنسی تھی مری آنکھوں میں نمی
ایک افسانہ سنا، ایک کہارات گئے

اُس نے کھولیں جو ذرا نیند سے بوجھل آنکھیں
میں یہ سمجھا درِ مینجانہ کھلا رات گئے

ہم علیٰ سُنکے بھی انجان سے انجان ہے
زندگی دُور سے دیتی تھی صدارت گئے

آئینے تو بہت ملے لیکن
اپنا چہرہ ہمیں کہیں نہ ملا



بال بکھرا کے چہرے پہ ڈالے گئے
رات آتی، سحر کے اُجالے گئے

تیری آنکھوں کا کاجل گھٹالے اُڑی
پھول عارض کی خوشبو چرالے گئے

دوستوں کی مدارات کے واسطے
میری آنکھوں کے ساغر کھنگلے گئے

ساری دنیا بہاروں سے الجھی مگر
اک ہمیں تھے جو دامن بچالے گئے

ساتھ میرے مری گمراہی یوں چلی
راستے جیسے منزل اٹھالے گئے

ایک ایوان کی روشنی کے لئے
کتنے آباد گھر پھونک ڈالے گئے

اُن کی محفل میں بٹتے تھے آنسو علی
ہم بھی آنکھوں کے لیکر پیالے گئے



چھوڑ دے ہاتھ لے بہار مرا
حادثوں کو ہے انتظار مرا





کون جاتے کدھر آتی ہے کدھر جاتی ہے
زندگی ایسے دیے پاؤں گزر جاتی ہے

آج ہنستے ہوئے چہروں کو ترستی ہے نظر
زخم رستے ہیں جہاں تک کہ نظر جاتی ہے

خار بن کر کبھی آنکھوں میں کھٹکتی ہے حیات
پھول بن کر کبھی قدموں میں بکھر جاتی ہے

تیری بھری ہوئی زلفوں کا سہارا پا کر
رات بھسکی ہوئی کچھ اور سنور جاتی ہے

زندگی تھی جو حوادث کے مقابل کل تک
آج خود اپنی ہی پرچھائیں سے ڈرجاتی ہے

آپ مفہوم محبت نہ خدرا سمجھیں
آپ دوروز میں چہرے کی اتر جاتی ہے

موڑ ہوتا ہے علی وہ کسی مینا نے کا
گردش وقت جہاں آ کے ٹھہر جاتی ہے



ہنگامہ حیات سے جب واسطہ پڑا
ہر حادثے سے اپنا پتہ پوچھنا پڑا





وقت نے جب دھوپ پھیلائی بہت
یاد آئی اپنی پر چھائی بہت

تنگی دریاؤں نے بخشی مجھے
میکدوں نے آنکھ پھلکائی بہت

مہربانوں کے کرم سے جو ملے
تھی انہیں زخموں کی گہرائی بہت

ہم ہی بھاگے زندگی سے دور دور
زندگی ہم سے قریب آئی بہت

میکدوں سے کام کیا مجھ کو علی
ہے یہ میرا جامِ مینائی بہت



دل کس کا غم و درد سے معمور نہیں ہے
آرام تو ہے شہر کا دستور نہیں ہے

لو جلتے چرخوں کی بہت تیز ہے لیکن
بیچھتے ہوئے چہروں پہ نہیں نور نہیں ہے

جو رات کہ مدت ہوئی دم توڑ چکی تھی
کیا اب بھی وہی رات بدستور نہیں ہے

سو کھلے ہوئے ہونٹوں پہنسی آؤ گئی ہے
لیکن ابھی پلکوں سے نئی دور نہیں ہے

کیوں خون چرخوں میں جلانے ہو ہمارا
ایسا تو کسی بزم کا دستور نہیں ہے

ہلسنے کیلئے بھی ہے ایازت کی ضرورت
یہ اسکی ہے روداد جو مجبور نہیں ہے

میں قد تو علی اور ذرا اپنا بڑھاواں
لیکن مرے احباب کو منظور نہیں ہے



گلشن گلشن دام بہت ہیں
اب یہ منظر عام بہت ہیں

میخانے آیا دہلیں دل کے
لوٹے پھوٹے جام بہت ہیں
آزادی کی بات نہ پوچھو
آزادی کے دام بہت ہیں

شعروں پر کچھ آپرخ نہ آئی
پروانے بدنام بہت ہیں
گیسو، لب، رخسار، تنسم
فصل گل کے نام بہت ہیں

ہم کو طعت دینے والو
تم پر بھی الزام بہت ہیں
ہمکے جن سے شعر علی کے
ایسے گل اندام بہت ہیں



وقت کو جب بھی اسبیروں کا خیال آیا ہے
لیکے زنجیر ہر اک پاؤں نہیں ڈال آیا ہے

دوڑنا کہ — ساتھ بہاروں کے رہی گردِ خزاں
پھول مہکے ہیں تو زخموں کا خیال آیا ہے

رکتے رکتے ہی سہی، کچھ تو عنایت ہو جواب
ڈرتے ڈرتے مرے ہونٹوں پہ سوال آیا ہے

وہی دوری، وہی دیوار، وہی تشنہ لی
لیکے محکوم یہ کہاں روز وصال آیا ہے

میرے افکار سے لپٹی ہے ترے جسم کی بو
میرے شعر و نہیں ترے رنگِ جمال آیا ہے

کو ہزاروں پہ کبھی برقِ جواہر آئی ہے
تیرے ڈھلنے ہوئے آنچل کا خیال آیا ہے

ایک اک لفظ کو بخشا ہے علی میں نے لہو
تب کہیں جا کے مرے فن میں کمال آیا ہے



آنکھوں سے دل کا درد جھلکتا دکھائی دے
خالی ہے شیشہ اور چھلکتا دکھائی دے

اس راہ سے بے فیض جنوں ہم گزر گئے
جس راہ میں خیال بھی تھکتا دکھائی دے

وہ پھول ہے نہ اس کو ہے نسبت بہار سے
پھر بھی بدن تمام مہکتا دکھائی دے

آنکھوں میں لیکے آپ کے نقش قدم کوئی
دیر و حرم کے پاس بھٹکتا دکھائی دے

دم توڑتی ہے کیا کوئی دیر بینہ آرزو
دل کے قریب کوئی سسکتا دکھائی دے

تنہائیوں کی شام خیموں کی اوٹ سے
کندن سا ایک جسم دکھتا دکھائی دے

اک دل ہی پچ رہا تھا علی وہ بھی شام سے
مثل چراغ صبح بھڑکتا دکھائی دے



درد کے ڈھیر ملے زخم کے اتیار ملے
دامنِ دشت سے تادامنِ گلزار ملے

آج کس موڑ پہ یہ عشق کے بازار ملے
پیار کے نام پہ جسموں کے خریدار ملے

اُن کے ہونٹوں سے سنسی مانگ ہی ہے دنیا
جن کو روتے کیلئے دیدہ منو تیار ملے

ظلمتوں کو جو نچوڑا ہے تو سبکی ہے سحر
خارزاروں کو سمیٹا ہے تو گلزار ملے

تج کو ہم ڈھونڈنے نکلے تو تری یادوں کے
چند ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پس دیوار ملے



فضا بہار کی چپ ساڑ کی تو خاموش
صدائے درد کے آگے ہے ہر صدا خاموش

یہ خشک ہونٹ یہ تر آنکھ یہ بچھے ہرے
یہ لوگ عہد کا ہیں اپنے مرثیا خاموش

نہ جانے آج کہاں ہیں وہ دار کے اہی
پڑا ہے کب سے صلیبوں کا راستا خاموش

بڑے عجیب سے یہ قاصد ہیں قربت کے
نگاہ تازہ ہے چپ چپ ادا خاموش

یہ سنتے ہیں کہ علی میکہ کے موٹھے وہ
جہاں سے ہو کے زمانہ گزر گیا خاموش



اے کشتہ رزمِ در راہِ وفا اندازِ خیال و فکر بدل
سو گامِ خمرِ دے ساتھ چلا دو گامِ جنوں کے ساتھ بھی چل

اے برقِ جلا کر گھر اپنا کیا طرف سے تیرا دیکھ لیا
تنگوں میں مری کیا رکھا تھا چھٹا تھا کسی کا رنگِ محل

سوچا تو سمجھ میں یہ آیا دیوانے ہمیں تھے کچھ شاید
تنداں کو نشینِ جانِ بیا گلشن کو سمجھ بیٹھے مقتل

ناداںِ ذرا سی ہستی کا کیوں اتنا بڑا ہنگامہ ہے
دو گام کا یہ افسانہ ہے اک گامِ حیاتِ اک گامِ اجل

کچھ سایے بھرتی زلفوں کے کچھ دھوپِ مزاجِ دوراں کی
دیکھو تو کہاں تک آج علی ہے پھیلا ہوا دامنِ غمزل



ایک مدت ہوئی مسکرائے ہوئے آئیگی آتے آتے تہنسی دوستو
دقت نے اشک تو پونچھ ڈالے مگر اب بھی آنکھوں میں ہے کچھ نمی دوستو

چھوڑ کر بن جاؤں گا یہ آشیاں تنکے تنکے میں ضم ہے مری داستان
ایک اک پھول پر میرا حق بھی تو ہے میں بھی جان چن تھا کبھی دوستو

ایک دو پھول گلشن کے ہکے تو کیا کتنے گوشے تو اب بھی ہیں ابرو ہوئے
کیا یہی موسم گل کا انصاف ہے کیا صیا کا چلن ہے یہی دوستو

غم نہیں اب جو ہیں پھول گلشن میں کم ہر قدم پر یا فراط ہیں غم
جب بھی شکوہ تہی دامن کا تہ تھا اب بھی دامن نہیں ہے تہی دوستو

خون ہو کر علی کا جگر حب بہا درو افکا کے روپ میں ڈھل گیا
ایک اک حرف تاریخِ امر و تر ہے اسکو سمجھو نہ تم شاعری دوستو



نہ وہ صہبائے نہ وہ مینائے نہ وہ جام کہیں ساقی
کہاں ہے آج وہ میخانہ ارض دکن ساقی

یہ عارض کی لطافت ہے تو پھولوں کا فدا حلقہ
یہ آنکھیں ہیں تو ہے بیکار ساغر کا چلن ساقی

وہی ہستی وہی گرمی وہی رنگت وہی خوشبو
مئے رنگیں ہے شیشے میں کہ ہے تیرا بدن ساقی

ہجومِ یادہ ساغر میں بھی جلسے اکیلا ہوں
مری تنہائیاں ہیں انجمنِ دریا بخشن ساقی

اٹھا کر جام تو ہی میرے ہونٹوں سے لگا دینا
مرے ہاتھوں میں ہو جب سہرا نہا پیرہن ساقی

علیٰ ان پر تقدق ہیں چینِ قمر بان میخانے
تراشے ہیں مرے شعروں نے ایسے گلبدن ساقی



خوشی نے محکو ٹھکرایا ہے درد و غم نے پالا ہے
گلوں نے بے رخی کی ہے تو کانٹوں نے پہنچا ہے

محبت میں خیال ساحل و منزل ہے نادانی
جوان راہوں میں لٹ جائے وہی تقدیر والہ ہے

جہاں بھر کو متاعِ لالہ دگلِ بخشنے والو
ہمارے دل کا کانٹا بھی کبھی تم نے نکالا ہے

کناروں سے مجھے اے ناخداؤ دور ہی رکھنا
وہاں لیکر چلو طوفاں جہاں سے اٹھنے والہ ہے

چراغاں کر کے دل بہلا رہے ہو کیا جہاں والو
اندھیرا لاکھ روشن ہو اجالا پھر اجالا ہے

نیشہ من ہی کے لٹ جانے کا غم ہوتا تو غم کیا تھا
یہاں تو نیچنے والوں نے گلشنِ بیچ ڈالا ہے



ایسی بھی زندگی ہیں دعا مانگتے ہیں لوگ
مجرم نہیں ہیں اور سزا مانگتے ہیں لوگ

سب کچھ تو نذرِ خاطر احباب کر چکا
اب اور اس غریب سے کیا مانگتے ہیں لوگ

آنکھوں میں چھو رہی ہے کرنِ آفتاب کی
گھبرا کے ظلمتوں کی دعا مانگتے ہیں لوگ

رکھتے ہیں دوستوں سے توقعِ خلوص کی
صحراؤں سے نسیم و صبا مانگتے ہیں لوگ

یہ جیس یہ گھٹن یہ در و بام یہ حصا
جینے کو آج تازہ ہوا مانگتے ہیں لوگ

احساسِ کمتری نے دکھایا یہ دنِ عسی
حق بھی بنامِ لطف و عطا مانگتے ہیں لوگ



سنتے ہیں غم و درد میں تاثیر بڑی ہے
 ٹپکا ہے کہیں خون کہیں چھینٹ پڑی ہے

تنہائی کی چلن جو پڑی تھی سو پڑی ہے
 آئی ہے تری یاد مگر دُور کھڑی ہے

خوشبو سے بدن آتش لب، سرخی عارض
 کتنوں کی جوانی مرے ساغر میں پڑی ہے

کانٹوں کی خلش میری کہانی کا ہے ٹکڑا
 پھولوں کی ہنسی تیرے فسانے کی کڑی ہے

وہ ایک کرن گوشہ دل میں جو پڑی ہے
 وہ ایک کرن کتنے اندھیروں سے لڑی ہے

ماضی کو علیٰ ہم نے بھلایا تو ہے لیکن
 جیسے کوئی پر چھائی ابھی ساتھ کھڑی ہے



اب چھلکتے ہوئے ساغر نہیں دیکھے جاتے
توبہ کے بعد یہ منظر نہیں دیکھے جاتے

مست کر کے مجھے اوروں کو لگا منہ ساتی
یہ کرم ہوش میں رہ کر نہیں دیکھے جاتے

باغبانوں کا یہ اندازِ نظر تو دیکھو
پھول بھی پھول سمجھ کر نہیں دیکھے جاتے

اُن سے کہہ دو کہ وہ تکلیف نہ دیں آنکھوں کو
جن سے یہ بڑے ہوئے مگر نہیں دیکھے جاتے

ہم نے دیکھا ہے زمانے کا بدلنا لیکن
ان کے بدلے ہوئے تیور نہیں دیکھے جاتے

ساتھ ہر ایک کے اس راہ میں چلنا ہو گا
عشق میں رہزن و رہبر نہیں دیکھے جاتے



زہرِ غم پی کے ہنسی ہونٹوں پہ بکھرا لائے
ہم ترے شہر سے جیسے کا سلیقا لائے

وقت کل اپنے اشاروں پہ چلا کرتا تھا
ہے کوئی آج جو اس وقت کو پلٹا لائے

ہم تو بربادِ زمانہ تھے ہمارا کیا تھا
آپ کیوں اچھی بھلی آنکھ کو چھلکا لائے

دوستوں کیلئے ہم بن کے جلے شمع و چراغ
اپنے گھر کیلئے مانگے کا اچالا لائے

اپنے دامن کا بھرم بھی تو مجھے رکھتا تھا
لانے والے تو مرے واسطے دینا لائے

فکرِ منزل میں تھکن ہم نے مٹائی نہ علی
راستے لاکھ گھنٹے پیسٹروں کا سایا لائے



میرے احباب کو اب فکر یہی رہتی ہے
دیر تک کیوں مرے ہونٹوں پہ ہنسی رہتی ہے

زندگی سے کبھی رہتا ہے بس اتنا رشتہ
پاس رہ کر بھی بہت دُور کھڑی رہتی ہے

یال بکھرا کے جہاں آپ ٹھہر جاتے ہیں
بس وہیں جاتی ہوئی رات رکی رہتی ہے

تم تو جھونکے کی طرح آ کے نکل جاتے ہو
دیر تک وقت کی رفتار ٹھہرتی رہتی ہے

اپنے چہرے بھی نظر آتے نہیں اپنے علی
ان پہ یوں گردِ مہ و سال جمی رہتی ہے



آپ کے ہونٹوں کی سرخی ہو بہو
جیسے ٹپکا ہو ابھی تازہ لہو

سامنے دل کے نظر کے ردِ پرو
بیچ دی ہم نے قسم کی آبرو

بھبھکی آنکھوں پر ہیں سایے زلف کے
شام ڈھلتی ہے کتارِ آبرو

ان کے عارضِ لالہ و گل کا بھرم
ان کی آنکھیں میسکدے کی آبرو

کرتے والوں نے چراغاں تو کیا
یہ نہ دیکھا کس کا جلتا ہے لہو

وقت ہی اس کا کرے گا فیصلہ
مور و الزام میں ہوں یا کہ تو

مصلحت صحرا کی جانب لے گئی
سامنے تھی کائناتِ رنگ و بو

نشئی گفتگوں کی یاد آئی مجھے
جب کبھی ہونٹوں تک آیا ہے سببو



کتنے افسانے بنے پیار کی رسوائی تک
میری تنہائی سے لیکر تری انگڑائی تک

تذکرہ جب بھی غزالانِ حین کا نکلا
بات پہنچی وہ ترے پیکرِ زیبائی تک

میری پلکوں پہ پڑی ہیں ابھی اُن کی بھین
صبح کی دھوپ اُتر آئی بھی انگنائی تک

تلخ یادوں کے نئے زخمِ عنایت کر کے
لے گئی چھین کے دنیا میری تنہائی تک

زندگی ساتھ ہے مدت سے نہیں یہ بھی غلط
یہ بھی سچ ہے کہ نہیں اس سے شناسائی تک

چھو کے پٹی جو نظر میری کبھی اس کا بدن
دیر تک جیسے بہ سکتی رہی بینائی تک

سب نے دیکھا فقط الف ظ کی رنگینی کو
کوئی پہنچا نہ خیالات کی گہرائی تک

بیچ رستے میں سبھی تھک کے علی بیٹھ گئے
کوئی پہنچا نہ صلیبوں کی مسجاتی تک



آپ کے ساتھ اور یہ لمحات
جیسے پھولوں پہ چل رہی ہے حیات

دھیمی دھیمی ہے آگ جسموں کی
قطرہ قطرہ پگھل رہی ہے رات

جن پہ سائے تھے ترپے اپنیل کے
اڑ گئے پر لگا کے وہ لمحات

کر گئے شاخ شاخ کو زخمی
نرم و نازک تھے کیا بہار کے ہات

زور طوفاں کا تھم گیا لیکن
 ڈوبنے کے ابھی ہیں امکانات

ہم تو بدنام ہی سہی لیکن
 آپ پر بھی بہت ہیں الزامات

فرشِ گل سے بساطِ صحرائِ تناک
 کتنے خانوں میں بٹ گئی ہے حیات



وہ آتے ہیں پلکوں پہ آنسو سجائے
غم زندگی سے کہو مٹ کر آئے

یہ موسم یہ ساقی، یہ زلفوں کے سائے
گناہوں سے اب کون دامن بچائے

یہ سمجھو گلی ہے وہ میسکدے کی
جہاں چلتے چلتے قدم ڈمک گئے

بڑھیں جب کبھی الجھنیں زندگی کی
تری زلف کے خم بہت یاد آئے

حوادث نے روکی جہاں راہ اپنی
وہیں جستجو کے نئے موڑ آئے

ذرا اپنا ذوقِ اسیری تو دیکھو
چمن بیچ کر ہم قفسِ مول لائے

خدا کیلئے یوں نہ بکھراؤ زلفیں
گھنی چھاؤں پا کر کوئی رک نہ جائے

علیٰ اپنی حالت پہ ہم بھی ہنسے کچھ
بڑی دیر تک لوگ بھی مسکرائے



کانٹوں سے تھمے بھرے ہوئے گلشن جگہ جگہ
الجھامری نگاہ کا دامن جگہ جگہ

رکھنا قدم سنبھال کے اے فاصدِ بہار
ٹوٹی ہوئی ہے شاخِ نشیمن جگہ جگہ

شمع و چراغ دے نہ سکے ساتھ وقت کا
جتنا رہا بس اک دل روشن جگہ جگہ

پھینکانہ ایک تے بھی کوئی پھول اس طرف
پھیلا مرا بہار میں دامن جگہ جگہ

سارا زمانہ گوشِ بر آواز ہے علی
کام آئی میرے قلب کی دھڑکن جگہ جگہ



انگریزائی کے جال تن رہے ہیں
 لمحات شراب بن رہے ہیں
 تنہا بیویوں ہنسو نہ ہم پر
 ہم بھی کبھی انجمن رہے ہیں
 جلوے جو سمٹ کے رہ گئے تھے
 آپنچل کی تہوں سے چھن رہے ہیں
 ہم سے ہیں لطافتیں عبارت
 ہم آبرو چسمن رہے ہیں
 افسانہ تو ایک ہی ہے لیکن
 عنوان ہزار بن رہے ہیں
 پھولوں کی نفیس سیج پر بھی
 مجروح بدن بدن لہے ہیں
 سستا ہے عسکی لہو ہمارا
 ہم لوگ شہدفن رہے ہیں



روزِ اک غم سے ملاقات ہوئی جاتی ہے
 خوب زخموں کی مدارت ہوئی جاتی ہے
 جو نہ کہنا تھا وہی کہہ گئیں میری آنکھیں
 جو نہ ہونی تھی وہی بات ہوئی جاتی ہے
 کیا قیامت ہے کہ روداد ہمارے غم کی
 شاملِ حرف و حکایات ہوئی جاتی ہے
 ایک کا بھی نہ ملا آج تک کوئی جواب
 زندگی تندرست سوالات ہوئی جاتی ہے
 پھر ترے شہر کی جانب ہی قدم اٹھتے ہیں
 پھر وہی صورتِ حالات ہوئی جاتی ہے
 وہ جہاں ہیں وہیں پھوٹی ہے آج کی کرن
 جس جگہ ہم ہیں وہیں رات ہوئی جاتی ہے
 روشنی دی تھی علی جس نے زبان و فن کو
 گل وہی شمعِ روایات ہوئی جاتی ہے

زندگی آج بعنوانِ دگر یاد آئی

شب کے اوراقِ جوالے تو سحرِ یاد آئی

شامِ غربت کا جو اتر اہوا چہرہ دکھیا

اپنے دامن پر پڑی گریہ و سفرِ یاد آئی

پھول نہکے تو کسی زخم کا آیا ہے خیال

جام چھلکے تو کوئی پیاسی نظرِ یاد آئی

گردِ شبِ وقت نے چھوٹی نہ کوئی رازِ

ہائے کس وقت تری راہِ گزریاد آئی

لالہ گل سے ہو جب بھی تعارفِ اپنا

زندگی خارِ بکفِ خاکِ بسرِ یاد آئی

اے علی اسکے تعاقب میں ٹھہری تھیں نظریں

دفعاً اپنی ہمیں مدِ نظرِ یاد آئی



خشک ہونٹوں پہ کیا ہنسی آئی
 رگزاروں میں چاندنی آئی
 بعد مدت کے آئی یاد تری
 وہ بھی جیسے تھکی تھکی آئی
 پھول کسکے بدن کا یہ مہکا
 بو کدھر سے گناہ کی آئی
 ہم صلیبوں کی سمت جاتے تھے
 زندگی تو کہاں چلی آئی
 میرے شعروں میں وہ بدن جھلکا
 چمن کے لفظوں سے روشنی آئی
 کتنے جی دھک سے ہو گئے ہیں علی
 میرے ہونٹوں پہ جب ہنسی آئی



اور چہرہ کوئی چہرے پہ لگایا جائے
اجنبی بن کے ترے شہر میں جایا جائے

آئیے پھر سے صلیبوں کو سجایا جائے
عرقِ گل میں نہیں خون میں نہایا جائے

آپ ہیں ساتی دوراں تو شکایت کسی
جس قدر زہر پلاتا ہو پلایا جائے

شبتم و گل کی لطافت وہ بدن ہے لیکن
ہا تھ جل جائیں اگر ہا تھ لگایا جائے

زلف و رخسار تو نہکیں گے بہر حال علی
فکر کو خواہ کسی موڑ پر لایا جائے



مے کے۔ مینا کے۔ جام کے رستے
یہ نہیں خاص و عام کے رستے

نقش پا آئینہ دکھاتے ہیں
ہیں یہ کس خوشخرام کے رستے

لذت کرب پو چھئے ہم سے
ہم نے دیکھے ہیں دام کے رستے

شمع رخسار کوئی سلگا دے
دھندلے دھندلے ہیں شام کے رستے

تجھ سے بچ کر کوئی کہاں جائے
ہیں سبھی تیرے نام کے رستے

پستیوں کی طرف نگاہ نہ کر
دیکھ بالاۓ نام کے رستے

مجھ کو پہنچا گئے مرے گھر تک
آپ سے انتقام کے رستے

کس دور ہے یہ مجھ کو لاۓ علی
یہ حلال و حرام کے رستے



خوشی کی دھوپ تبسم کی چاندنی تہ ملی
حیات کیسی ہیں اس کی گرد بھی نہ ملی

ہجوم گل ہوا اتنا کہ رک گئیں سانس
جلے چراغ کچھ اتنے کہ روشنی نہ ملی

جو پی کے مست تھے برسے انہیں پہنچانے
جو تشنہ لب تھے انہیں ایک بوند بھی نہ ملی

لگی رہی مرے قدموں کے ساتھ وقت کی ٹھوڑی
کہاں کی زلف صلیبوں کی چھاؤں بھی نہ ملی

تمہارا ساتھ جہاں تک رہا غنیمت تھا
پھر اس مقام پر عمر رواں کبھی نہ ملی

نہ جانے لوگ کہاں سمیٹ لاتے ہیں
ہمیں تو ایک تبسم کی بھیک بھی نہ ملی

وہ یار ہمارے دل کے قریب سے گزرے
مگر کچھ ایسے کہ قدموں کی چاپ بھی نہ ملی

چراغ لیکے بہت ہم نے اے علی ڈھونڈا
کسی مقام پہ بھی ہم کو روشنی نہ ملی



تم اہلِ ظرف ہو پہلے یہ فیصلہ تو کرو
نظر اٹھاؤ تجلی کا سا منا تو کرو

حیات سایہ ہی سایہ نہیں بھڑھوپ بھی ہے
غموں کے ساتھ بھی کچھ دور تک چلا تو کرو

میں ظلمتوں سے اجالے نچوڑ لاؤں گا
تم اپنی زلف مرے بازوؤں پہ اٹو کرو

ہزار چہرے تمہیں آئینہ دکھائیں گے
شکست اپنی انا کا تم آئینا تو کرو

زمین پہ چاند ستارے بکھیرنے والو
ہمارے گھر میں بھی روشن کوئی دیا تو کرو

تمہیں نظام چین کو اگر بدلنا ہے
گلوں سے رائے لو کاتٹوں سے مشورہ تو کرو

علی غزل کی روایت کا احترام بجا
مگر غزل کو تیا پیہر بن عطا تو کرو

•
سامنے آکھی لے جانِ غزل
حرف و الفاظ کے پردوں سے نکل
•



پردہ وقت بدلتا رہا منظر کتنے
لٹ گئے سامنے آنکھوں کے بھرے گھر کتنے

میکدے تو بہت آباد نظر آتے ہیں
لیکن ان میں ہیں مرے نام کے ساغر کتنے

یہ بھی دیکھو تو ذرا یاغ لٹاتے والو
ساتھ پھولوں کے چلے آئے ہیں پتھر کتنے

کیا خبر تھی کہ شراروں میں تلے گی شبنم
داد مانگی تو ملے طنز کے نشتر کتنے

اپنی تاریخ کے ہم آپ مورخ ہیں علی
دیکھو رکھے ہیں قلم خون میں ڈبو کر کتنے

زلیت دار و رسن تک — آپہنچی
 تیغ کے بانگین تک — آپہنچی

ذکر پھولوں کا جب کبھی نکلا
 بات اُس کے بدن تک — آپہنچی

بات جو آسکی نہ ہونٹوں تک
 بات وہ انجمن تک — آپہنچی

وقت کی گرد میرے دامن سے
 آپ کے پیر ہن تک — آپہنچی

ذکر حیا بھی چھڑا غزل کا علی
 بات میرے سخن تک — آپہنچی

تیرگی لی ہے روشنی دی ہے
ہم نے دنیا کو زندگی دی ہے

کون اس تشنگی کو چھلکائے
میکدوں نے جو تشنگی دی ہے

مجھ کو بخشے ہر ایک نے آنسو
میں نے ہر ایک کو ہنسی دی ہے

تیرے گھر میں رہے اجالا کیوں
تو نے جب مجھ کو تیرگی دی ہے

آبرو بیچ کر عسلی ہم نے
چار دن کی ہنسی خریدی ہے

دن ہے وہی سورج ہے وہی صبح وہی ہے
سب کچھ ہے فقط ایک اجائے کی کمی ہے

بھرنائی ہے دامن میں ستاروں کے تراشے
وہ ایک کرن جو ترے آنچل سے چھتی ہے

زنجیر جو تھنی پاؤں میں وہ کٹ گئی لیکن
حالات کی زنجیر تو پاؤں میں پڑی ہے

ہنستے ہوئے ہونٹوں پہ نہیں ہیں مری نظریں
پڑھتا ہوں وہ تحریر جو چہروں پہ لکھی ہے

باتیں تو علیٰ اور بھی کہنے کی ہیں لیکن
خاموش رہو مصلحتِ وقت یہی ہے

قطعات

رباعی

رنگوں کی طرح نکھر گئی ہے دنیا
 پھولوں کی طرح سنور گئی ہے دنیا
 کس نے یہ مرے دوش پہ کھولیں زلفیں
 خوشبو کی طرح بکھر گئی ہے دنیا



ہم سے پوچھو جو پیار کرتے ہیں
 کتنے مشکل ہیں پیار کے رستے
 اپنی پلکوں سے ہم نے جھٹائے ہیں
 مدتوں انتظار کے رستے



دل کا آئینہ اک تماشا ہے
 جس کو کوئی سمجھ نہیں پاتا
 اس میں سب کچھ نظر تو آتا ہے
 اپنا چہرہ نظر نہیں آتا



یاداب بھی جو بدن کی تیرے
رات کے وقت کبھی آتی ہے
ایک مانوس سی خوشبو جیسے
میرے کمرے میں چلی آتی ہے



یہ اجالا کہاں سے پھوٹا ہے
جو اندھیرے کا رخ سنوار چلا
دل کی حسرت کوئی سلگ اٹھی
یا کہیں شام کا چہرہ اغ چلا



دوست دشمن میں فرق کیا کرتے
ہر قدم پر ہزار تھے دھوکے
دیکھنے پر بھی کچھ نہیں دیکھا
ایک چہرے پہ تھے کئی چہرے



یوں فریب آپ کو کب تک دو گی
 نام میرا نہ کہاں تک لو گی
 اپنی یادوں کے ورق الٹو تو
 میری تھویر کہیں تو ہو گی



ظلمتیں جس قدر جوان ہوئیں
 اور بھی کچھ ستور گئے تارے
 بھیگی راتوں کی اوس پی پی کر
 بن گئے کتنے پھول انگارے



لوٹ کر وقت لے گیا سب کچھ
 میکہہ ہے نہ کوئی ساتی ہے
 جل کے یادوں کو ہو گئی مدت
 اب تو یادوں کی راہ باقی ہے



آہ پوچھو نہ انتظار کی بات
 شمع کے ساتھ جل رہا ہوں میں
 ایک ویراں طویل رستے پر
 جیسے مدت سے چل رہا ہوں میں



اتنے دھوکے دیے ہیں صبحوں نے
 لوگ اب روشنی سے ڈرتے ہیں
 منہ بہاروں کا چومنے والے
 آج اک اک کلی سے ڈرتے ہیں



یوں تو راتیں ہزار دیکھی ہیں
 کالی زلفوں کی رات ہے کچھ اور
 یہ ہمکتے ہوئے گھنے سایے
 ان اندھیروں کی بات ہے کچھ اور



حادثے جب شور کر کے تھم گئے
 زخم دل کا اور کچھ تازہ ہوا
 اے علی طوفاں گزر جانے کے بعد
 اپنی بریادی کا اندازہ ہوا



میں ہوں کیا چیز اور کیا، سستی مری
 دیکھئے دھوکا نہ کھا جائے نظر
 میں بجائے خود نہیں ہوں روشنی
 کر رہا ہوں مشعلیں لبیک سفر



دیکھنے کی ہے اب قمرِ رت کیا
 ہر ادا اس کی دلشیں ہوگی
 ظاہر آواز کی مٹھاس سے ہے
 وہ یقیناً بہت حسین ہوگی



زندگی کو مری نکھار گئے
 غم کے طوفان درد کے دھارے
 اشک آنکھوں سے جیب بھی ٹپکے
 دھل گئے راستوں کے اندھیلے



دوش پر میرے بال کھول بھی دو
 کینک کوئی اس طرح تر سے
 کہیں ایسا نہ ہو کہ اب کے بھی
 لوٹ جائے گھٹایہ بے برسے



خود فریبی سے فائدہ کیا ہے
 اس طرح دور غم نہیں ہوتے
 اے علی آنکھیں موند لینے سے
 کچھ اندھیرے تو کم نہیں ہوتے



کا پنخ کے دیوار و در میں بیٹھ کر
 گھر کسی کا کیا اجاڑا جائے گا
 آپ پتھر ہاتھ سے رکھ دیجئے
 آپ سے پتھر نہ مارا جائے گا



کیا ضرورت ہے کہ میں آنکھ اٹھا کر دیکھوں
 ہر ادا سے تجھے پہچان لیا کرتا ہوں
 تو ہزار آئے دے پاؤں مرے دل کے قریب
 تیری خوشبو سے تجھے جان لیا کرتا ہوں



اتنی تنہا تو نہ تھی تنہائی
 کوئی سب لوٹ گیا ہو جیسے
 حال اب یہ ہے تہیہ دستی کا
 ہاتھ وہ چھوٹ گیا ہو جیسے



تیرے پیار کی بھیگی رست میں
 مہکے ہے یوں دل کا آنگن
 بارش کے پہلے چھینٹوں میں
 جیسے مٹی کا سوندھا پن

پڑتی ہے جس مقام پر ہنتی نہیں نظر
 دلکش ہے و نشین ہے جہاں سے تجھے پڑھوں
 یہ شعریت - یہ طرز ادا - یہ شگفتگی
 اے حسن کی کتاب کہاں سے تجھے پڑھوں

یہ بھی کیا کم ہے کہ دم بھر سیلے
 تیرگی تو رات کی کھوجائے گی
 گھر مرا جلتا ہے جلجائے مگر
 روشنی کچھ دیر تو ہو جائے گی

